کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا

سعد اللہ شاہ

ریاظ ۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

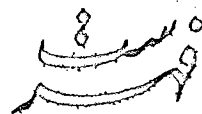
معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔





کبھی کتابوں کی صورت کبھی رسالوں میں
ہمارا نام ملے گا سبھی حوالوں میں

وہ قیمتی سہی لیکن تھا خام صورت میں
تراش کر اُسے لایا ہوں میں مثالوں میں

کچھ اپنے بارے میں

مسلسل ایک ہی حالت میں حیات کرنا مشکل نہیں، ناممکن ہے کسی بھی کیفیت کا ثبات فطرتِ انسانی سے بعید عمل ہے۔ ہر ردِ عمل کا تغیّر تازگی اور نمو کا جواز بنتا ہے۔ تخلیقی محسوسات کا تحرک اندرونی اور بیرونی عوامل کے تابع ہوتا ہے۔ اس تحریک کا تربیّت اور نظریے سے ٹکراؤ یا ملاپ اندرونی اور خارجی رویوں کو بدل دیتا ہے۔ لیکن بعض جذبے اصول وضوابط کی بندشوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مگر ایسی صورتِ حال کو اپنی تمامتر خوبصورتیوں اور رعنائیوں کے باوجود اپنے دل و دماغ پر طاری ہونے سے روکنا چاہیے۔ لمحاتِ نشاط کا لمبا دورانیہ باطن کی آنکھ کو دھندلا کر رکھ دیتا ہے۔

خواہشاتِ کشت کو عریاں ہونے سے روکنا بھی ضروری ہے۔ مگر ان کا کچھ حق ہے جو مشتِ خاک کی اڑان سے پیشتر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر دھیان گیان کے دریچے وا ہو جائیں تو خوشی کی ساعتیں بہت جلد غم کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں اور پرنم آنکھ زمین کے رشتوں کی گواہی بن جاتی ہے۔ اشکِ درد میں بھیگا ہوا لفظ

ہی صفحۂ قرطاس پر مُہرِ معانی ثبت کر سکتا ہے یہ بخشیش غیبی ہاتھ پر رکھی آ
" کوئی شام شہرِ خراب ہیں" والی سرخ شام اپنی سرمئی یادیں اپنے
میں سمیٹتے ہوئے سیاہ شب کے اندر جا چھپی ہے۔ ایک تاریک رات راستو
صرف روشنی ہی نہیں اٹھاتی بلکہ خوف بھی اتارتی ہے یہ تو امیدِ سحر ہے جو راہ
منزل کی سمت کھینچتی رہتی ہے بعض اوقات توانا گھوڑے کی طرح اور بعض
تھکے ہوئے بیل کی طرح، اس لیلِ اسود کے سمندر میں آنکھ سے گرتے والا
روشنی کرتا ہے۔ یہی عاجزی میری طاقت ہے اور فطرت کی کمزوری۔

افسردگی، مایوسی یا اُداسی مستقل کیفیت کا نام نہیں' اسے بارِ دگر محسوس
سے پہلے کہیں کھونا پڑتا ہے۔ نوحہ خوانی اور ماتم ایک لمحاتی ردِّ عمل ہے۔ آ
کا زور رفتہ رفتہ انجام کو پہنچتا ہے، کسی بھی لمحے کا انجام حتمی نہیں ہوتا۔ تخلی
سطح پر تو ہر انجام ایک نیا آغاز فراہم کرتا ہے۔ کہیں ملاپ یا جدائی کے سن
فرصتِ یک نفس مہیا ہو جائے تو سوچ درِ عقل پر دستک دیتی ہے اور یہا
آ کر انسان اپنے جذبوں کو باہم برسرِ پیکار دیکھتا ہے۔ اس جنگ میں اپ
ماتحت سارے جذبے اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں۔

صراطِ مستقیم سے تھوڑا سا انحراف اس کے سیدھے پن کا احساس اجا
کرتا ہے۔ اسے بغاوت کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ یادوں کے سا
شام کے دھندلکے کو سنہرا کر دیتے ہیں۔ خیال کے بادل ہوائے غم کے
مل کر اڑتے بھی ہیں مگر کچھ عرصہ بعد زمینِ دل کو جل تھل بھی کر دیتے ہیں
جہاں لہو اور بارود کی بو ایک سی ہو جائے وہاں حواسِ خمسہ میں انتشار پ
ہو جاتا ہے اس خرابی کی داستان " ادھوری رات کا غم " اور " کوئی شام شہرِ خرا

کی صورت جذبوں کی تجسیم بن کر سامنے آتی ہے۔

نیند اور جگراتے کے سنگم پر دم بھر کے لیے روح کی گہری نیلی جھیل میں
جسم کا اترنا ایک فطری فعل ہے۔ مگر اس کے پیچھے پتھروں کا گرنا خارجی حملہ
ہے۔ جھیل کے پانی میں ارتعاش اور اپنے دامن کو دور تک پھیلاتے ہوئے
دائرے سطحِ آب پر اپنا نقش بھی نہیں چھوڑتے مگر ان نقوش کو آنکھ پتلیوں پر
اٹھائے پھرتی ہے اور یہ نشانیاں حیاتِ فانی کی متحرک دلیل ہیں اور یہی انسان
کے مخلوق ہونے کا یا خدا کے خالق ہونے کا اعلان ہے۔

انتہائی سنجیدہ طرزِ احساس کا ایک پہلو رومانوی دنیا سے بھی جڑا ہوتا ہے
اس کا انکشاف استدلال کا متقاضی بھی نہیں ہوتا۔ اس لازم و ملزوم خطہ میں غم اور
خوشی دونوں اترتے ہیں اور اپنا اپنا حصہ بانٹ لیتے ہیں لیکن یہ دونوں رویے
ایک بال برابر فاصلے سے جدا ہوتے ہیں اور بعض اوقات غیر ارادی طور پر ایک
دوسرے کی جُو میں مکمل داخل ہو جاتے ہیں۔

کوئی بھی موسم ہو محسوس کرنے والے کے تابع ہوتا ہے۔ میرے ہاں ماحول
کو طاری کرنے کا عمل کچھ وقت لیتا ہے پھر ایک 'سپیل' میں کوئی بھی خیال ہم خیال
لمحات کو تصویر کر دیتا ہے۔ کڑی سے کڑی اک زنجیر بنتی نظر آتی ہے۔ کوئی صورت
وقت سے بیشتر بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں عمل کو بے رحم ردِّ عمل کا
سامنا کرنا پڑتا ہے تسلیم کی خُو ہر کسی میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے تربیت
ضروری ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں راہ سے ہٹے ہُوئے رویّہ کو بیک جنبشِ قلم
رد کر دیا جاتا ہے۔ ان عوامل پر غور کرنا کہ جس کی بدولت انہونی صورت پیدا ہوتی
ہو ایک مدبّرانہ ادا ہے۔ اس الہامی اور وہبی سلسلہ میں وہی تخلیق کار جم سکتا ہے

جو ہر نتیجہ کے سود و زیاں کا تخمینہ لگا کر توازن قائم کر سکے۔

لوگوں کی منفی تصویر آئینۂ دل کو دھندلا دیتی ہے۔ اس مایوسی کا تار و پود رگوں سے پھوٹتا ہے اور پورے جسم کے اندر جال بُن دیتا ہے جہاں اُمید کا پنچھی مدتوں پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ مکمل نا اُمیدی میں بھی یہ کاوشِ احتجاج اپنا ہی مزہ رکھتی ہے اس بے دست و پائی میں فکر مندی، بہت ضروری ہے، اگر محبّت کے ذریعہ اس بے جذبہ صورتِ حال کا تدارک ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ اس لافانی احساس سے مایوسی کے زہر کا تریاق پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بے چینی اور بے سکونی تخلیق کے ارفع و اعلیٰ لمحات میں میسّر آتی ہے یا پھر مکمل غیر تخلیقی موسم میں نخلِ جاں پر اترتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان بے ثمر ساعتوں کو بار آور کیسے بنایا جائے۔ زمینِ فہم و ادراک کی آبیاری سحر گاہی میں کی جائے۔ مگر اس اہتمام کے باوجود ایک احتمالِ انتشار اس میں ضرور ہے، عمل اور ردِّ عمل کو ذہن پر برداشت کر کے ہی دل کو کسی کارِ خیر میں اثبات تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ بے رنگ دورانیے کا saturation point بھی جلد آ جاتا ہے مگر اس کا انتظار تو واجب ہے۔ رنگین دورانیے غم کا استعارہ ہیں اور ان کو ظاہر کرنے والے نقاط بعض اوقات خط کی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔

سکون اور طوفان ایک ہی سمندر کی دو حالتیں ہیں اور ہر دو ایک دوسرے کی پہچان بھی۔ ہر حالت اپنی جگہ معتبر ہے۔ اسی طرح ادب میں شہرت اور بے نامی زندگی کی دو صورتیں ہیں۔ اصل میں شہرت ایک کرزما ہے اس میں ضروری نہیں کہ بے نامی کو رد کرنے کا عمل ہو۔ شہرت پراپیگنڈا سے اور بے نامی کھوکھلاپن سے مختلف ہے، محبّت تاج محل کی ہو یا کٹیا میں پیدا ہونے والی، دونوں ایک

بے ساختہ پھوٹتے ہوئے چشمے کی طرح ہیں جو سنگلاخ زمین کی چھاتی کو چیر کر نکل پڑتا ہے۔ محبّت کو شہرت کی ضرورت نہیں تاہم شہرت نخلِ محبّت کو ثمر کی طرح لگتی ہے اور بیج بن کر ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ یہ چیز آخر کار تمام اردگرد کو متاثر کرتی ہے اور یہیں سے زندگی کی شاعری جنم لیتی ہے۔

میرے ہاں شعر کے لیے ہر شے محرک ہوتی ہے۔ مگر ہر تحریک حسنِ خیال کو پیکرِ شعر میں نہیں ڈھالتی۔ تصورات اور خیالات تو ہر آن پیرایۂ اظہار میں آنے کے لیے کمپیوٹرائزڈ رہتے ہیں۔ مگر اس کمپیوٹر کی پروگرامنگ خواہش کے برعکس دل کے ماتحت ہوتی ہے۔ یہ کمپیوٹر حواسِ خمسہ کے ذریعہ feed کیا جاتا ہے بعض اوقات درونِ ذات کی نقال قوت اس کے سارے منصوبے تہس نہس کر دیتی ہے۔ دماغ کی کنٹرول لائن بھی دل کے تابع ہے۔ جہاں سے وہ تمام کمپیوٹر کو remote فراہم کرتا ہے، وگرنہ خود کار یکسانیت کا اندیشہ رہتا ہے۔

اس شعری مجموعے "کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا" میں بھی ایک ایسا ہی تخلیقی رُخ آپ کے سامنے آئے گا۔ یہ نیا ذائقہ بھی ہے اور پرانے کے ساتھ ملا ہوا بھی۔ نئے سے دوبارہ انحراف بھی، کہ حال کو ماضی کے ساتھ دوبارہ جوڑا جا سکے۔

سعد اللہ شاہ

52/G ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

غزل

جو ایک بار ملے ہیں کہاں مدام ملے
خوشی کی بات ہے جتنی دفعہ سلام ملے

نہیں ہے دعویٰ سخن کا کہ ہم بھی جانتے ہیں
کسے خبر ہے کہ کس شعر کو دوام ملے

حمدِ باری تعالیٰ

مری منزلوں کو جو غیب سے ملے راستہ، اے مرے خُدا
تو میں جسم و جان کا جوڑ لوں کوئی رابطہ اے مرے خُدا

تو علیم بھی، تو قدیر بھی، تو عظیم بھی، مری لاج رکھ
مری ذات پر نہ اتارنا کوئی سانحہ، اے مرے خُدا

جو ہمیشہ تجھ سے ڈرے رہیں، ترے سامنے ہی جھکے رہیں
مرا ساتھ ان کے ہی ساتھ کر جو کریں ثنا، اے مرے خُدا

مجھے ہر کشش سے نکال دے، مجھے سیدھی راہ پہ ڈال دے
وہ جو آنکھ خود کو بھی دیکھ لے، مجھے کر عطا اے مرے خُدا

ترے مصطفٰےؐ کا ہوں اُمّتی، تری رحمتوں کی طلب مجھے
ترے اذن سے ہیں شفاعتیں، تُو ہی آسرا، اے مرے خدا



شام گہری ہو رہی ہے دیکھنا
یہ بچھڑنے کی گھڑی ہے دیکھنا

دم بخود ہیں پیڑ، پنچھی اور مَیں
رات بھر کی تیرگی ہے دیکھنا

وقت گزرا جا رہا ہے دم بدم
اور اپنی بے بسی ہے، دیکھنا

رات کی رانی سے مہکی سانس اور
چال بھی بے ربط سی ہے دیکھنا

سعدؔ اپنا مال و زر ہے بس یہی
اس فضا میں زندگی ہے دیکھنا

ہم بُھلائیں اس کو اس ماحول میں!
سعدؔ اپنی سادگی ہے دیکھنا



ہوائے درد چلی تو ترا خیال آیا
تو خار ہو کے بھی اک پھول کی مثال آیا

عدو کو اپنے میں خود سے بڑھا کے دیکھتا ہوں
شکست کھائی تو پستی پہ یہ کمال آیا

ملال رُت میں وہ تیرا شریک تھا شاید
غمِ حیات کو باہر سے ہی میں ٹال آیا

بچھڑ کے اس سے ملا ہے ہمیں بھی کیا کیا کچھ
فراق رستے میں اپنے ہر اک وصال آیا

بڑھائے گی یہ خوشی بھی تو غم کی شدّت کو
اگر عروج پہ آ کر مجھے زوال آیا

دیا جواب اگرچہ ہر ایک دشمن کو
مگر نہ پوچھ جہاں دوست کا سوال آیا



یہ جو عشق تھا یہ جو پیار تھا مرا خواب تھا
کسی اور درد کا شہر بھی تہِ آب تھا

یہ عجیب ہے کہ مَیں بے خبر رہا خود سے بھی
مرے ہاتھ سے جو نکل گیا وہ شباب تھا

دل و جاں میں جیسے اٹک گیا کوئی خار سا
مرے کوٹ پر ترے ہاتھ کا جو گلاب تھا

تھیں جو مہر و ماہ کی گردشیں وہ کہاں گئیں
کہیں اور ہی مرے روز و شب کا حساب تھا

ترے پیار میں مری چاہتوں کی تھی بے بسی
مجھے کیا خبر یہ گناہ تھا کہ ثواب تھا

وہ وصال تھا کہ فراق تھا مری ذات سے
مرے پاس کوئی سوال تھا نہ جواب تھا

مرے سعدؔ چھوڑ دے سوچنا کہ یہ عشق ہے
جسے پیار تُو نے سمجھ لیا وہ عذاب تھا

○

کوئی الزام محبت پہ نہ اب آنے دو
ختم ہوتا ہے اگر ربط تو ہو جانے دو

شمع جلتی ہے تو جلتی ہی چلی جاتی ہے
اس کے پہلو میں پڑے رہتے ہیں پروانے دو

ہار کا زخم تو سینے سے چمٹ جاتا ہے
یہ جو بہلاتے ہیں اب دل کو تو بہلانے دو

ڈھیر غلّے کا اگر ہے تو نہیں اس کے لیے
چونچ میں چڑیا کے آتے ہیں فقط دانے دو

بوجھ اُٹھانا نہیں ممکن رہا اب میرے لیے
کیا یہ کم ہے کہ اُٹھا رکھے ہیں جو شانے دو

درد لمحوں میں کوئی لمحہ سکوں سے گزرے
دل جو دہراتا ہے باتوں کو تو دہرانے دو

اُس کی یادوں کا گزر جیسے کوئی نعمت ہے
یہ ہے خوشبو تو اِسے رُوح کو مہکانے دو

مَیں جو ہارا ہوں تو پھر اتنا تو حق دو مجھ کو
چند گھڑیوں کے لیے ہی مجھے پچھتانے دو

○

زمیں تنگ رہی آسمان کُھلنے تک
تھا خوف تیر کا لیکن کمان کُھلنے تک

وہ لفظ لفظ مرے دل میں مضطرب ہی رہا
بندھا ہوا تھا وہ جیسے زبان کُھلنے تک

طنابیں کھینچنے والے سے پوچھ کر دیکھو
ہوائیں تھیں بھی کہیں بادبان کُھلنے تک

ہر ایک بات معمّا دکھائی دیتی ہے
مگر یہ راز ہے دل پر جہان کُھلنے تک

عجیب بات کہ ہم پر ہوا بھی بند رہی
سروں پہ ابر کا اک سائبان کھُلنے تک

پلٹ سکو جو یہاں سے تو پھر پلٹ جاؤ
فصیلِ جاں سے کوئی دیدبان کھُلنے تک



وہ چاند تھا تو مرے گھر پہ ہی چمکتا کیوں
صبا تھا وہ تو کسی دسترس میں رہتا کیوں

مجھے تو شوق نے رکھا ہے ایک عالم میں
مَیں کیا بتاؤں کہ مجھ سے خفا ہے دنیا کیوں

مَیں صاف صاف بتا دوں کہ درد کس نے دیا
خود آپ اپنے ہی غم کو بڑھا لوں، اچھا کیوں

تمھاری سوچ بھی اپنی جگہ غلط تو نہیں
اگر وہ سانپ نہ ہوتا تو مجھ کو ڈستا کیوں

حواس باختہ ہو کر کہا تو ہو گا مگر
وہ میری دُنیا سے سچ مچ نکل ہی جاتا کیوں

بصیرتوں سے بصارت کو رنگ ملتے ہیں
مَیں غور و فکر کے لمحات کو گنواتا کیوں

اے سعدؔ فطرتِ گُل بھی تو آدمی سی ہے
دُعا نہ مانگنا ہوتی تو پھُول کِھلتا کیوں

کسی کے درد کی قیمت اگر نہ ہوتی کوئی
تو اس طرح سرِ بازار سعدؔ بکتا کیوں

○

جو ایک بار ملے ہیں کہاں مدام ملے
خوشی کی بات ہے جتنی دفعہ سلام ملے

نہیں ہے دعویٰ سخن کا کہ ہم بھی جانتے ہیں
کسے خبر ہے کہ کس شعر کو دوام ملے

ہیں خواہشات پہ مبنی ہمارے سارے خواب
وہ جب ملے ہیں کبھی ہم سے، ہمکلام ملے

عجیب درد تھا اس کی خوشی کے اندر بھی
کہ جیسے رات کی چوکھٹ پہ آ کے شام ملے

کوئی بھی کام ہو مقصد ہے مختلف سب کا
کسی کو دام ملے تو کسی کو نام ملے

ہمیں بتاؤ کہ آزاد کس طرح ہیں ہم
اگر یہ ہے تو ہمیں بھی کوئی مقام ملے

یہ سانحہ ہے کہ سب کچھ ہی لُٹ گیا اپنا
ہمیں ملے بھی تو اپنے لہو کے جام ملے



زندگی کے ساتھ ہیں خدشات بھی
دن گزارا ہے تو کاٹو رات بھی

کس قدر ہے بوجھ میرے ذہن پر
کیوں گراں تھی اس پہ کرنا بات بھی

یہ زباں تو پہلے دن سے گنگ ہے
اب مخالف بولتے ہیں ہات بھی

دشمنوں سے رابطے کاٹے گئے
دوستوں نے ہے لگائی گھات بھی

اک پرندہ آنکھ سے اوجھل ہوا
اور ہلتا رہ گیا اک پات بھی

خاک زادے تُو بس اتنا یاد رکھ
جان لیوا ہے بھری برسات بھی

کیا بتائیں ہم کہ اپنے آپ سے
جیت کر بازی ہے کھائی مات بھی

سعدؔ گو وہ جنگ میں مارا گیا
کام آئی اس میں اپنی ذات بھی

○

کسی بھی وہم کو خود پر سوار مت کرنا
خیالِ یار کو گرد و غبار مت کرنا

خلافِ واقعہ کچھ بھی ہو سُن سنا لینا
یہی طریقہ مگر اختیار مت کرنا

تمہاری آنکھ میں نفرت ہو دوسروں کے لیے
تم اپنی ذات سے اتنا بھی پیار مت کرنا

نشہ چڑھا ہے تو پھر یہ اتر بھی جائے گا
جو ہے سرور تو اس کو خمار مت کرنا

کوئی بھی رُت ہو وہ اپنا جمال رکھتی ہے
خزاں جو آئے تو اس کو بہار مت کرنا

غموں کے ساتھ تو جینا ہے عمر بھر کے لیے
خوشی کے ساتھ تو ان کو شمار مت کرنا

کسی کو جان کے انجان بن کے ملنا سعدؔ
کسی کے ساتھ بھی یہ ظلم یار مت کرنا

○

عدُو سے جنگ میں پنجہ لڑا کے دیکھیں تو
وہ شاہ زور سہی، آزما کے دیکھیں تو

جھکا دیں خود کو کبھی ہم فرازِ حق کے لیے
انا کو اپنی ذرا سا بھلا کے دیکھیں تو

شکست و فتح تو آ کر یقیں پہ ٹھہرے گی
کہ کشتیاں کبھی اپنی جلا کے دیکھیں تو

کسی بھی لہجے میں چاہے کسی زبان میں ہو
کوئی بھی حرفِ دُعا دل میں لا کے دیکھیں تو

ہمارا عشق ابھی تک یقیں پہ قائم ہے
اب اس یقیں پہ عمل کو بڑھا کے دیکھیں تو

اگرچہ خشک ہیں باتیں مگر یہ کام کی ہیں
اسی ڈگر پہ کہانی بنا کے دیکھیں تو



ہر پل جیسے، پاس لگے ہے ایک پہاڑ کی چوٹی
ایسے ہی مری آنکھ میں میری خواہش ٹھہری چھوٹی

کونسی بات ہے زندہ رہ کر ہو جو مجھ سے پوری
چکّر میں ہے مرتے دم تک گندم کی اک روٹی

ہر ناکامی پر میں نے اک نیا بہانہ ڈھونڈا
کچھ نہ بنا تو کہہ دیا مَیں نے قسمت میری کھوٹی

اتنا کہہ کر دیکھو مَیں تو ہر الزام سے نکلا
میری بات سمجھ نہیں پایا جس کی عقل تھی موٹی

اپنے ہاتھ کو دیکھا اُس نے اور اتنا فرمایا
گوڑھا رنگ تو چڑھتا ہے پھر ہو جو مہندی گھوٹی

سعدؔ کہانی کتنی پرانی لیکن آج بھی زندہ ہے
اب بھی دیکھو وہیں ہے لومڑ اور کوّے کی بوٹی



وہ وقت تھا کہ کسی کا ہمیں خیال نہ تھا
ہماری آنکھ پہ ظاہر ابھی جمال نہ تھا

ہم اپنی ذات میں رہتے تھے کھوئے کھوئے سے
ہمیں کسی کے بچھڑنے کا کچھ ملال نہ تھا

ہمیں زمانے نے سب کچھ سکھا دیا ورنہ
ہمارے ہاتھ میں ایسا کوئی کمال نہ تھا

مَیں جانتا تھا کہ آئے گا ایک دن لیکن
مگر عروج میں پنہاں یوں اک زوال نہ تھا

یہ بات الگ ہے کہ وہ بھی جواب دے دیتا
مگر ہمارے لبوں پر کوئی سوال نہ تھا

یہ کیا طلسم کہ اک دوسرے کو جان گئے
اگرچہ رابطہ اپنا کبھی بحال نہ تھا



مجھے زمانے سے بچنا ہے، دُور ہٹنا ہے
اور اس کے بعد مسائل سے بھی نمٹنا ہے

ہر ایک سمت کوئی خوف سا ہے طاری یہاں
ردائے یاد میں گویا اے دل لپٹنا ہے

مجھے تو چاہئے دنیا جہان کی وسعت
کہ اپنی ذات میں مجھ کو بھی اب سمٹنا ہے

یہ دنیا کتنی حسیں ہے کہ ہر کسی کو یہاں
بچھڑتے وقت بھی اس کو ہی جا چمٹنا ہے

مجھے تو اپنی پلوشن نے مار ڈالا ہے
ہے اس سے کیا کہ جو اوزون کو بھی پھٹنا ہے

پرانی بات ہے جب لوگ ایسے سوچتے تھے
کہ ایک دوجے پہ آخر ہمیں جھپٹنا ہے

مجھے بچاؤ کہ میں بھی بھٹک نہ جاؤں کہیں
تمہارا ہاتھ پکڑ کر جھٹک نہ جاؤں کہیں

جو رابطوں میں ہمارے خلا بھی باقی ہے
تو پھر سمجھ لو کہ نقشِ وفا بھی باقی ہے



بشر ہوں مَیں تو یہ حق بھی ادا کروں یارو
خطا کروں جو نہ کوئی خطا کروں یارو

لوازماتِ محبّت میں یہ بھی شامل ہے
جسے منانا ہو اُس کو خفا کروں یارو

اُڑا کے مجھ کو کسی نے خلا میں پھینک دیا
کہ مَیں بھی وزن سے باہر رہا کروں یارو

ہوں بادبان سے لڑتی ہوئی ہوا کی طرح
مَیں ساتھ کشتی کے کیسے چلا کروں یارو

یہ غم زدہ سی کہانی جو زندگی ہے مری
وہ چاہتا ہے، اسے بھی لکھا کروں یارو

وہ بات جو مرے دل میں کبھی نہیں آئی
مَیں چاہتا ہوں کہ وہ بھی سُنا کروں یارو



اک نیا راستہ نکالا ہے
ہم نے منزل سے خود کو ٹالا ہے

خالی ہاتھوں ہوا کے اندر بھی
اُس نے اک گیند سا اچھالا ہے

خوف بھی ہے بہت، اماں بھی ہے
اس مکاں میں کہ جس میں جالا ہے

پھر اسی کو چُنیں گے ہم سب لوگ
جس کے ہاتھوں میں تیز بھالا ہے

ہم ہواؤں سے خواب پکڑیں گے

ہم نے نظروں کا جال ڈالا ہے

آؤ کانٹے بکھیرو رستے میں

میرے پاؤں پہ بھی تو چھالا ہے



مری خواہشوں کی صورت مرا وہم ہے یہ سارا

نہ کسی نے مجھ کو چاہا نہ کسی نے ہے پکارا

تری صورتوں سے کھیلیں یہی مشغلہ ہمارا

کبھی اس کو ہے بگاڑا، کبھی اس کو ہے سنوارا

مری چاہتوں کے اندر ہے عجیب سی یہ منطق

جو نہیں ہے چیز میری مرا اس پہ بھی اجارا

یہ جو تم سمجھ رہے ہو ہے گمان سے بھی آگے

ذرا خود سے باہر آ کر مجھے سوچنا دوبار

مری سوچ بھی جدا سی، مرا غم بھی ہے جدا سا
تری آنکھ سے ہے مخفی مری آنکھ کا اشارا

تُو سمجھ رہا ہے مجھ کو، مَیں سمجھ رہا ہوں تجھ کو
یونہی دُور دُور رہ کر ہمیں کرنا ہے گزارا



ہم نے منزل کو جو اپنی خود ہی جادہ کر لیا
گویا اپنے آپ کو ہی پا پیادہ کر لیا

اک عمل جو اختیاری تھا وہ ہم نے یوں کیا
آج سے ہی کام کرنے کا ارادہ کر لیا

پھر پریشانی پہ اس کی درد یکجا ہو گئے
ہے خوشی کی بات ہم نے غم لبادہ کر لیا

لاتعلق ہے جو تجھ سے اپنی بود و باش میں
اس سے ہی وابستہ خود کو کیوں زیادہ کر لیا

چھت ہمارے رشتے کی تھی ایک ہی شہتیر
شک کی دیمک سے اسے ہم نے بُرادہ کر

کتنا وہ مظلوم ہے جو ہوش سے محروم
اک تماشہ بن گیا جب شغلِ بادہ کر



گو ہے پھولوں میں خار، ہے تو سہی
کوئی اپنا بھی یار ہے تو سہی

وہ اُڑاتا ہے بس ہنسی میری
اُس کی نفرت میں پیار ہے تو سہی

اپنا احساس بھی نہیں مرتا
خود سزائی کو دار ہے تو سہی

مجھ کو یادوں سے جوڑنے کے لیے
اُڑتی کونجوں کی ڈار ہے تو سہی

گو یہ ڈالا ہے میرے دشمن نے
اس گلے میں بھی ہار ہے تو سہی

ہے بُرا یا بھلا مگر دل سے
تم پہ کوئی نثار ہے تو سہی

سنگ کاٹے گی دیکھنا اک دن
دل پہ بارش کی دھار ہے تو سہی

کھنچتا جاتا ہوں سعدؔ اُس جانب
کوئی دریا کے پار ہے تو سہی

○

آسودگیٔ جسم ہے روحوں کی زندگی
شیشے کا عکس ہے مرے خوابوں کی زندگی

لہرا رہی ہے تار سی جیسے خلاؤں میں
کہنہ روایتوں میں ہے جدّت کی تازگی

اپنے تصورات سے لڑنا نہیں ہے سہل
دیکھو یہ من چھپا لے جو اپنی برہنگی

ممکن نہیں کہ دل بھی چلے ساتھ عقل کے
بے منزلِ مراد ہے ورنہ یہ دل لگی

اِس کا ہے عکس جھیل میں لیکن ہے دل میں خوف
پانی ہلا تو ساتھ وہ صورت بھی جائے گی

ہے لطف تب کہ آنکھ میں دریا بھی پاس ہو
ورنہ تو بے جواز ہے اپنی یہ تشنگی!



احساسِ رائگانئ عمرِ رواں نہیں
ناکامئ حصول مری جاں کہاں نہیں

ڈالے ہیں پردے حق پہ ہماری ہی عقل نے
ورنہ ہماری آنکھ سے کچھ بھی نہاں نہیں

ہاں ہاں بچائی ہم نے وہاں اپنی آبرو
لکھی ہوئی تھی چہرے پہ اس کے جہاں نہیں

ہم آسماں زمیں سے کیسے جُدا کریں
کہتے ہیں اپنے سر پہ کوئی سائباں نہیں

کچھ غور کر کے دیکھو تو اپنی ہی ذات پر
گر اس میں بندگی کو کوئی آستاں نہیں

ہے جاگنے سے نیند ہی بہتر کہ کچھ تو ہے
مقصد بغیر ورنہ کہیں بھی اماں نہیں



یہ رات دن کا بدلنا نظر میں رہتا ہے
ہمارا ذہن مسلسل سفر میں رہتا ہے

نظر میں اس کی تو وسعت ہے آسمانوں کی
گو دیکھنے کو پرندہ شجر میں رہتا ہے

ہمارا نام وہ لے لے تو لوگ چونک اٹھیں
کہ فرد فرد ہمارے اثر میں رہتا ہے

شجر شجر جو ثمر ہے تو دیکھ خود کو بھی
جہانِ نو کا تصوّر ثمر میں رہتا ہے

ہر ایک بات کا بالکل یقین آیا مگر
ہمارا خوف تمہارے "اگر" میں رہتا ہے

تجھے گماں ہے کہ منزل پہ تُو پہنچ بھی گیا
ہر ایک شخص یہاں رہگزر میں رہتا ہے

اسے سکون ہے اس سے کہ ہم کو چین نہیں
بس اک جنون ہماری خبر میں رہتا ہے

نہیں ہے کچھ بھی وہ اے سعدؔ بس خیال سا ہے
مگر خیال کا سودا تو سر میں رہتا ہے



ایک بادل سا مری آنکھ میں بھی چھایا تھا
سبز موسم مرے آنگن میں اتر آیا تھا

پیڑ پر میری تمنّا کے نمو زور پہ تھی
ایک عالم پہ کوئی جیسے نشہ چھایا تھا

ہر طرف پھیلی تھی خوشبو سے بھری تیز ہوا
جسم کو روح تلک کون پکڑ لایا تھا

کیفیت میری تھی اس لمحہ بیاں سے باہر
مَیں جہاں بھی تھا مرے سر پہ کوئی سایہ تھا

کوئی بلبل، کوئی چڑیا کہ کوئی اور پرند
ایسے موسم میں تو ہر ایک مجھے بھایا تھا

سعدؔ ایسے میں مرے دل نے کسی مستی میں
ان سُنا گیت محبّت سے بھرا گایا تھا



عجیب دن ہیں کہ سب منظروں سے باہر ہوں
مَیں دائرے میں کھڑا دائروں سے باہر ہوں

کرخت لہجہ مرا اُس کو کس طرح بھائے
مَیں پُر اثر ہوں مگر ساحروں سے باہر ہوں

اگرچہ مَیں بھی تھا شامل ہر اک لڑائی میں
مَیں جشنِ فتح پہ کیوں فاخروں سے باہر ہوں

جو مجھ کو پڑھتا ہے اس کو نشہ بھی آتا ہے
مَیں گرچہ مے ہوں، مگر ساغروں سے باہر ہوں

ہمیشہ کشمکشِ زندگی میں رہتا ہوں
میں اپنی ذات کے سب کافروں سے باہر ہوں
کشش بہت ہے مرے اِردگرد دانے کی
مگر میں دُور کہیں طائروں سے باہر ہوں



جو اختیار سے باہر تھا، اختیار کیا
کہ نفرتوں میں بھی ہم نے سبھی سے پیار کیا

کبھی جو سوچو تو اپنا خدا ہی حافظ ہے
کسی نے اپنی خطاؤں کو گر شمار کیا

بنا کے یاد اُسے ہم بُھلا بھی سکتے تھے
بُھلا کے اس کو یونہی ذہن پر سوار کیا

خدا کرے کہ رہیں خاک بن کے راہوں میں
ہمیں اڑا کے فضا میں کسی نے خوار کیا

خطا کہو کہ طبیعت مگر میں نادم ہوں
کسی کے ساتھ جو رشتہ نہ استوار کیا

کرشمہ ہے یہ اسی کا کہ پل جھپکتے ہی
بغیر ایک کے اس نے مجھے ہزار کیا



خیال تھا کہ میں خود سے وفا کروں یارو
الجھ گیا ہوں میں دنیا میں کیا کروں یارو

یہ رابطے ہیں کہ الجھے سے ریشمی دھاگے
پڑیں گی گانٹھیں جو ان کو جدا کروں یارو

ہنسی تو آتی ہے اس پر کہ مشورہ ہے خوب
کہ غم بھلا کے میں سارے ہنسا کروں یارو

ہو اختیار میں میرے اگر یہ سوچ مری
میں اپنی ذات کا عقدہ تو وا کروں یارو

انا کی بات ہے ورنہ یہ دل تو کرتا ہے
کہ اُس گلی میں کبھی میں صدا کروں یارو

یہ خواہشات کے پنچھی جو قید ہیں مجھ میں
ہے دل میں اب کہ میں ان کو رہا کروں یارو

تم ایک سمت سے آئے ہو اس لیے خوش ہو
چہار سمت جو دیکھے وہ کس لیے خوش ہو

سمجھ رہے ہیں کہ کیا کچھ ہمارے کام کا ہے
مگر خیال ہمیں منصب و مقام کا ہے



نہیں محدود اب اس کو سنانے تک
غزل پھیلی ہے دیکھو اک زمانے تک

گزرتا جا رہا ہے وقت ہاتھوں سے
مگر خاموش بیٹھے ہیں سیانے تک

وہ کیسا شخص تھا، اے سعد دیکھو تو
مسلسل رو رہا تھا جو ہنسانے تک

ابھی جو بات ٹھہری ہے بتانے تک
اسے ہم لے ہی آئیں گے منانے تک

ابھی کچھ اور گزرے گی تذبذب میں
ابھی وہ بات لاتا ہے بہانے تک

نہیں اس میں کوئی منطق یقیں مانو
کہ جائیں ہم اسے دل کی بتانے تک

نہیں پہچانتا کوئی کسی کو سعد
لُٹی ہے اب کے بستی بھی گھرانے تک



مَیں جیتا ہوں نیا منظر بنانے تک
مگر اس میں پرانے کو بچانے تک

جہاں آتش فشاں تھا عشق کا جذبہ
وہاں قسمت مجھے لائی دہانے تک

بہت محسوس ہوتی ہے جدائی بھی
کہ آنسو جب پہنچتے ہیں سرہانے تک

اسے نقشِ محبّت سے بہت چڑ تھی
وہ ملتا ہی رہا دل کو مٹانے تک

محبّت کی یہ دُنیا ہے تو ویرانہ
مگر کوئی نہیں پہنچا خزانے تک

بہت ہی خامشی میں گھر گئے ہیں سعد
یہی عالم رہے گا ابر چھانے تک



ہدف اس کا ہے پہنچا اب نشانے تک
وہ آیا ہے مجھے بھی آزمانے تک

اسے یہ فن بھی آتا تھا کہ اُس نے تو
رکھا ہے سرد دل کو بھی، جلانے تک

مجھے انصاف کیا ملتا کہ میں تو تھا
فقط کچھ اور شور و غل مچانے تک

مری دستار اور یہ سر کسی کے ہیں
مرا ہے کام بس ان کو اٹھانے تک

نہیں آساں حقیقت کو سمجھ لینا
ہیں کتنے سچ جو آتے ہیں فسانے تک!

مزا ہے سعد اظہارِ محبّت کا
مگر اک غم جو پنہاں ہے چھپانے تک



یہ زہر بھی زمانے ترے ہاتھ سے پیا
تُو نے اُسے بھی میرا ہی دشمن بنا دیا

ممکن نہیں تھا اس کے لیے دشت کا سفر
اچھا ہے مجھ سے اس نے کنارہ ہی کر لیا

ہم نے جو اعتماد کیا اپنی آنکھ پر
اے جان مانتے ہیں بہت ہی بُرا کیا

تھا تار تار سعد یہ دامن بُری طرح
ادھڑا ہے یہ کچھ اور بھی جب جب اسے سیا

اے سعدؔ ہم کسی سے بھی ملنے نہیں گئے
تنہائیوں کا زہر بڑی شان سے پیا



جس چہرے پر اوس کے چھینٹے وہ چہرہ گلنار ہوا
جو بھی آگ بجھانے آیا اس کو آگ سے پیار ہوا

منظر کی تکمیل کے پیچھے یوں اتنی بے چینی کیوں
جس سے ادھورا پن ہے غائب وہ کیسے شہکار ہوا

سب کچھ جانتے بوجھتے ہم نے پیار کیا تو کیسے کیا
اس رستے پر جو بھی آیا منزل منزل خوار ہوا

ہم بھی افراتفری میں ہیں اور ہیں جانے کس کے لیے
اپنے ہاتھوں اپنا جینا کیونکر یوں دشوار ہوا

نہ جانے کیوں یقیں آتا نہیں ہے

کیا ہے اس نے سب ظاہر بظاہر



اس ہوا نے وہی کیا آخر

دیپ جلتا بجھا دیا آخر

اپنے سچ پر اسے یقین نہ تھا

جھوٹ کا زہر بھی پیا آخر

کون آتا ہے پھر تسلّی کو

جب تڑپتا ہے یہ جیا آخر

ہم بھی دُنیا کے ساتھ چل نکلے

زخم اپنا جو ہے سیا آخر

زخم کی سعد اک روایت تھی
زخم اپنوں نے ہی دیا آخر



جو اپنی ذات میں خود کو چھپا لیا مَیں نے
تباہیوں سے زمانہ بچا لیا مَیں نے

وہ میرے ہاتھ کی مُٹھّی میں تھا ہوا کی طرح
وہ نقشِ آب تھا جس کو اُٹھا لیا مَیں نے

وہ میرا دیکھنا اس دم جو دیکھتا کوئی
کہ عمرِ رفتہ سے لمحہ چرا لیا مَیں نے

وہ نیلگوں سی فضائیں، ہری بھری خوشبو
ہے جھیل آنکھوں میں گلشن بسا لیا مَیں نے

کسی کے طرزِ تغافل کا ذکر مت چھیڑو
بس اس نے سُن لیا سب کچھ سنا لیا مَیں نے

ستارہ وار وہ آیا تو تھا کشش پہ مری
مگر جو رستے سے خود کو ہٹا لیا مَیں نے

مجھ ایسے شخص کو اب یہ نصیحتیں کیسی
کہ درد سینے میں جس دم دبا لیا مَیں نے



بڑھتی جاتی ہے اکتاہٹ
سُنتا نہیں کوئی دل کی آہٹ

گزرے دَور کی یادیں ہیں سب
سوکھے کنویں اور خالی راہٹ

جیسے سمندر میں اک طوفاں
اپنے اندر کی جھلاّہٹ

رستے میں مرے کوئی نہیں ہے
کس نے کہا ہے مجھ کو چاہٹ

روح کے کانوں سے کبھی سُن تو
من میں شیر کی سی غرّاہٹ



ہیں مطمئن جو آپ تو قسمت ہے آپ کی
شاید یہی سکون ضرورت ہے آپ کی

ہے برقرار آئنہ خانہ ابھی مرا
پتھّر کی مثل موم سی صورت ہے آپ کی

رشتہ ہے میرا آپ سے موتی کا سیپ سے
شاید مرے وجود میں لذّت ہے آپ کی

زخموں پہ میری دیر سے ہیں آپ خندہ زن
بے مایہ کے لیے یہی نصرت ہے آپ کی

جتنے وہاں کے غم ہیں سمٹتے ہیں آ کے یاں
وحدت میں کوئی دیکھے تو کثرت ہے آپ کی

کچھ بھی نہیں ہے پاس مرے پیار کے سوا
محفوظ میرے پاس امانت ہے آپ کی

اے سعدؔ 'آپ آپ' کی تکرار کس لیے
سوچو کہ شہر شہر تو شہرت ہے آپ کی



نہیں آیا کوئی مجھ کو بچانے تک
وہ شامل تھا مگر طوفاں اٹھانے تک

حقیقت تو عیاں ہوتی ہے ایسے ہی
یہی تھا بھید بار، آنکھیں چرانے تک

مجھے تو پل جھپکنے ہی ملا سب کچھ
نہ دھڑکا دل اسے دل میں بسانے تک

کرو تم جھوٹ بھی شامل جہاں تک ہو
مگر دیکھو کہانی کے سنانے تک

تمہاری سرد مہری، بے رُخی، نفرت
یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن ستانے تک

مسلسل مدّعا اپنا بیاں کر سعدؔ
مری چاہت کو اس دل میں بسانے تک



گو تھا سچ فسانے میں
دیر کی سُنانے میں

خاک ہو گئے ہیں ہم
راستہ بنانے میں

خامشی کو اوڑھ لے
شور ہے زمانے میں

خرچ ہو گئی زمیں
آسماں بنانے میں

وہ بھی رو دیا تو کیا
درد تھا فسانے میں

چھپ رہا ہے پیڑ بھی
اب کے آشیانے میں

عافیت ہے سعد جی
اس کو بھول جانے میں



میں ہوں خلانورد تو کیا وزن ہو مرا
لیکن نہیں ہے بوجھ کسی پر مرا ذرا

سایہ جو صبح سے ہی مرے ساتھ تھا
ہوتے ہی شام کیوں مری پہچان لے گیا

مدّت ہوئی ہے آپ کو ہم جانتے نہیں
معنی پہ غور کیجئے جو آپ نے کہا

ہم نے سفر سے اپنے نکالے کئی سفر
منزل سے دور رہ گیا اپنا کیا دھرا

نیزے گڑے تھے دھوپ کے چاروں طرف مگر
برگد کا پیڑ دھرتی پہ سایہ بنا رہا

چاہا ہے اس کو ہم نے تو ڈنکے کی چوٹ پر
ہاں ہاں ضرور دو مجھے اس جرم کی سزا

اے سعد ہم نے خاک چھپایا ہے پیار کو!
ہر ایرا غیرا ہم کو یونہی جاننے لگا



بھرا دامن بھگونے سے
دُھلیں گے داغ دھونے سے

یہ اکثر دل میں آتا ہے
کہ ہم بھی ہیں کھلونے سے

یہ نفرت کیا، محبّت کیا
تھا سب کچھ اس کے ہونے سے

یہ دل آباد رہتا ہے
مسلسل اشک بونے سے

ہے دھاگہ انگلیوں میں اب
بہت موتی پِروَنے سے

کوئی تو جاگ اُٹھے گا
مرے بیدار ہونے سے

یہ دل آباد ہوتا ہے
کسی کے دُکھ پہ رونے سے

اٹھاؤ سعدؔ خواب اپنے
جو مخمل کے بچھونے سے



ہوئے ساکت مناظر بھی کہ جیسے فلم چلتی ہے
ہماری عقل جامد کو تحرک میں بدلتی ہے

دیا قدرت نے ہر شے کو مقابل ملنے والا بھی
مری آنکھوں میں پانی ہے تو دل میں آگ جلتی ہے

مَیں اپنی سمت دیکھوں تو وہی ہے اک عمل جاری
برابر دن گزرتا ہے برابر رات ڈھلتی ہے

عمل بیدار ہونے کا کوئی تخلیق ہے شاید
سحر ہوتے ہی فطرت نیم وا آنکھوں کو ملتی ہے

مسلسل آگ کی صورت دھواں بنتا ہے صحرا بھی
ہوا جب ریگزاروں میں کسی شے کو مسلتی ہے

زمیں کا آسمانوں سے بچھڑنا ہی نہیں پنہاں
کہ یہ پانی کی صورت ہی تو دل کی آگ اُگلتی ہے



موت اک درندہ ہے، زندگی بلا سی ہے
صبح بھی اداسی ہے شام بھی اُداسی ہے

اپنی انتہا پر ہم شاید ابتدا میں ہیں
تب بھی بے لباسی تھی، اب بھی بے لباسی ہے

بادلوں کو آنا ہے لوٹ کر اسی جانب
یہ زمیں ہی پیاسی تھی، یہ زمیں ہی پیاسی ہے

یہ بھی ایک نعمت ہے، کاش تم سمجھ پاؤ
زندگی کے اندر جو اپنے اک خلاسی ہے

جانتا تو سب کچھ ہے وہ بھی میرے بارے میں
کیا کریں جو ظالم میں خوئے ناشناسی ہے

فرق ہے تو ہم میں ہے وقت ایک جیسا ہے
سن چھیانوے ہے یہ یا کہ سن چھیاسی ہے



دور رہا ہے مرکز سے جو پیارے ایک زمانے تک
اُس کو کچھ تو وقت لگے گا واپس خود میں آنے تک

ڈھونڈتے رہتے ہیں آسانی پل پل ہم اس دُنیا میں
ٹالتے ہیں ہر کام کو کل پر پھر سے نئے بہانے تک

ہر اقدام غلط ہے اپنا اور ہم سب کچھ جانتے ہیں
خود کو بھی چکّر دے لیتے ہیں بات اپنی منوانے تک

جلنا اور جلانا دونوں ایک ہی کام کے دو رُخ ہیں
شمع جلی پھر آخری دم تک اور جلی پروانے تک

سُنی سنائی بات نہیں ہے اپنی آنکھوں دیکھی ہے
اُن آنکھوں کی بات چلی تو پہنچی پھر میخانے تک

جتنی مرضی تلخ کہو تم سُننے والے بیٹھے ہیں
کتنا ہم بے چین رہے ہیں تازہ زخم اٹھانے تک

عجب طرح کا یہ بیگانگی کا عالم ہے
کہ فرد فرد پہ دیوانگی کا عالم ہے

میں جان و دل سے ہوں حاضر اگر ضرورت ہو
نکالنے کو مجھے دل سے، حل نکالو تو



آگ سے آگ لڑ گئی ہے
ایک مشکل سی پڑ گئی ہے

یہ بُلائے ہَوا مجھے بھی
کیوں طمانچہ سا جڑ گئی ہے

چند لمحوں کی یہ محبّت
اک فسانہ سا گھڑ گئی ہے

بات کچھ بھی نہیں اگرچہ
ذہن میں یونہی اڑ گئی ہے

اک جُڑی شاخ جھک گئی کیوں
بھر گئی ہے کہ جھڑ گئی ہے

اس کا پانی سے کیا بنے گا
جو پنیری کہ سڑ گئی ہے



جس نے دیکھا پار تک
آ گیا وہ دار تک

ایک پتّھر ہی تو ہے
سر جو ہے دستار تک

دوست بن کر سب رہے
اپنی اپنی مار تک

اک خلش تھی زخم کی
پھول آیا خار تک

ہم ہوئے آباد تب
جب لٹا گھر بار تک

سر سے مطلب کیا انہیں
جو گئے سرکار تک

سب ہیں اک پرواز میں
اپنی اپنی ڈار تک

سعدؔ چھپتا کچھ نہیں
نفرتوں سے پیار تک

○

کچھ نہ کہنے سے ہے بہتر کہ کچھ کہا جائے
چُپ رہے دیکھ کے جس سے کہ چپ رہا جائے

کیسا جینا کہ ہر اک ظلم ہے روا مجھ پر
اور ہے حکم بھی اس پر کہ سب سہا جائے

قطرہ قطرہ ہے جو مرنا تو پھر یہ بہتر ہے
آدمی اچھی طرح خون میں نہا جائے

اور تو کچھ نہیں بس میں ترے مگر پھر بھی
تُو ندامت کے اگر اشک ہی بہا جائے

ہم تو بے زار ہیں خود سے بھی اے جہاں والو
کچھ سُنا جائے نہ ہم سے نہ کچھ کہا جائے



پسِ دستِ حنائی وہ ترا ہنسنا
اٹھانا کاکلوں کو اور پھر ڈسنا

وہ پھرنا ساتھ سکھیوں کے مرے آگے
ملے موقع تو آوازہ بھی ہے کسنا

نکلنا کیوں نہیں ہے وہ مرے دل سے
اگر اُس کو یہاں رہ کر نہیں بسنا

مرا یہ ذہن پیچوں سے جُڑا ہے تو
کبھی ہے کھولنا اس کو کبھی کسنا

شکاری ہے تو ڈالے گا وہ جال اپنا
ہے مچھلی کو یہاں آ کر فقط پھنسنا

خُدا جانے کہاں مٹی ہماری ہے
کہیں کا ہے کوئی تو ہے کہیں بسنا



خوشیاں جو سو گئیں تو مرا درد جاگ اٹھا
ایسے لگا کہ شہر کا ہر فرد جاگ اٹھا

عورت سے اپنی ذات کی پہچان بھی گئی
اندر کا اس کے جب بھی کبھی مرد جاگ اٹھا

مبہوت ہو گیا تھا وہ گرمی کے زور میں
سایہ ہلا تو ہو کے وہی سرد جاگ اٹھا

ویران راستے پہ کہیں سو گیا تھا میں
آندھی چلی تو بن کے وہیں گرد جاگ اٹھا

اے سعد کھیل رنگ بھی کتنا عجیب ہے

ہم نے سلایا سرخ کو تو زرد جاگ اٹھا

اے سعد اک سکوت ہے اس دل کے آس پاس

کچھ بھی نہیں بچے گا اگر درد جاگ اٹھا



بہت ہی تلخ حقائق ہیں سامنے سب کے

مگر خموشی سے تکتے ہیں لوگ کیوں اب کے

وجودِ آدمِ خاکی کو ڈھونڈتے ہو کہاں

زمیں کے لوگ تو واپس بھی جا چکے کب کے

ہمارے ذکر کو چھوڑو کہ ہم تو تھے ایسے

ہمیں تو دوست بھی پیارے نہیں ملے ڈھب کے

اسی لیے تو ہیں دن کو ستارے آنکھوں میں

کہ ہم نے اشک چنے ہیں قدم قدم شب کے

گھٹا گھٹا اسے دیکھا ہے روشنی کرتے
ہیں باغ باغ چُننے پھول بھی اسی لب کے

عجیب بات کہ سب کچھ ہی پا لیا ہم نے
نہیں تھا ہاتھ میں اپنے کوئی ہنر جب کہ

وہی مقام ہے اونچا فرازئ سر کو
کہ تُو بحالتِ سجدہ قریب ہو رب کے



جیت جیسے مات سے
وہ ہے میری ذات سے

چاند خود ہے روشنی
کیا چُھپے گا رات سے

بن گئی زنجیر سی
بات نکلی بات سے

خود کو گھائل کر دیا
مَیں نے خود ہی گھات سے

غم ہی ملنا تھا مجھے
عشق کی سوغات سے

مٹ رہے ہیں لوگ خود
سعد اپنے ہات سے



ہنسی کی بات کہ اُس نے وہاں بُلا کے مجھے
بہت رُلایا کہانی مری سُنا کے مجھے

ہر ایک لمحہ مرا خوف کی گرفت میں ہے
محافظوں سے بچائے گا کون آ کے مجھے

کمال فن سے لیا کام اُس نے مجھ سے بھی
تباہ اپنے عدو کو کیا بچا کے مجھے

وہ باغ باغ ہوا ہے تو بے سبب بھی نہیں
ملا ہے کچھ تو اسے خاک میں مِلا کے مجھے

تمہیں خبر ہے کہ سر پر پڑے گی راکھ ترے
اُڑا دیا ہے فضا میں جو یوں جلا کے مجھے

اسے بنایا تھا مَیں نے بڑی ہی محنت سے
خُدا گواہ کہ وہ بھی چلا بنا کے مجھے

اسے کہو کہ ہیں حاضر، مزید دُکھ دے لے
بہت سکون ملا ہے اگر ستا کے مجھے



وقت تو وقت ہے رُکتا نہیں اک پل کے لیے
ہو وہی بات جو قائم بھی رہے کل کے لیے

منصفِ وقت! حقیقت ہے، حقیقت ہے خُدا
خوف لازم ہے بہرطور ہر اک حل کے لیے

اے مری خواہشِ تحصیل سُجھا دے مجھ کو
کوئی رستہ درِ امکانِ مقفّل کے لیے

مَیں سمندر ہُوں خموشی پہ نہ جانا میری
مجتمع کرتا ہوں طاقت کو بڑی چھل کے لیے

تربیت خون میں رچ جائے تو تب ہوتا ہے
ورنہ آساں نہیں جانا کسی کربل کے لیے

سعدؔ ڈرتا ہوں اگر میں تو بس اِک خواہش سے
وہ جو کر دے نہ برہنہ تجھے مخمل کے لیے



یہ مرا وہم و گماں اور یقیں کچھ بھی نہیں
سب مری آنکھ کا دھوکا ہے کہیں کچھ بھی نہیں

ایک لمحے کو یہ لگتا ہے کہ سب میرا ہے
دوسرے لمحے یہ احساس نہیں کچھ بھی نہیں

ایک امکاں پہ گزرتے ہیں شب و روز اپنے
ورنہ یہ سارے مکان اور مکیں کچھ بھی نہیں

ہے جو دل میں تو نہیں کچھ بھی ضرورت اس کی
ورنہ دہلیز پہ رکھّی یہ جبیں کچھ بھی نہیں

اپنے جینے کا جو مقصد ہے وہی ہے سب کچھ
آسماں کچھ بھی نہیں اور زمیں کچھ بھی نہیں

غور سے اپنی طرف دیکھے تو جانے کوئی
لے کے سب کچھ بھی تو وہ اپنے تئیں کچھ بھی نہیں

سعدؔ دھوکا ہے فقط آنکھ کا یہ حسن و جمال
دل یہ کہتا ہے مگر اس سے حسیں کچھ بھی نہیں

○

تنہائی میں رہنا مشکل ہوتا ہے
اپنے آپ کو سہنا مشکل ہوتا ہے

اپنے آپ سے ڈر جاتا ہوں اکثر میں
اپنی رَو میں بہنا مشکل ہوتا ہے

آگے پیچھے یاد آتا ہے کیا کیا کچھ
وقت پہ کچھ بھی کہنا مشکل ہوتا ہے

اس کو دل میں رکھّا کیونکر تنہا ہوں
خالی گھر میں رہنا مشکل ہوتا ہے

نفرت کی بنیاد نہ رکھو آپس میں
اس دیوار کا ڈھنا مشکل ہوتا ہے

سعدؔ طبیعت میں اکتاہٹ ہو تو پھر
کچھ سننا، کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے



کوئی پڑھے نہ پڑھے یہ عبارتیں میری
انہی کے دم سے ہیں قائم وزارتیں میری

بس اتنا یاد ہے اس کا وہ مسکرا دینا
بہت پسند تھیں اس کو شرارتیں میری

عجیب بات کہ اب تک نہ کھل سکیں مجھ سے
اُلٹ کے رکھ دیں جو اس نے بجھارتیں میری

کیا ہے اس نے جو مسمار، دشمنی تھی وہ
ہے غم کہ اپنوں نے ڈھائیں عمارتیں میری

مزاج ٹھنڈا بہت تھا اے دوست دشمن کا
کہ اُس نے چھین لیں مجھ سے حرارتیں میری

کچھ اور بڑھ گیا اس سے مرا تجسس بھی
جو کامیاب نہ ٹھہریں سفارتیں میری



دھوپ کاندھے پہ اٹھا کر کوئی بادل ٹھہرے
جلتے صحرا میں کہاں دیکھیے پاگل ٹھہرے

خامشی ہو تو کوئی بات سمجھ میں آئے
دو گھڑی کو جو کسی پاؤں کی چھاگل ٹھہرے

اپنا عرفان جو انساں کو کبھی ہو جائے
کتنی صدیوں پہ محیط آج کا پل پل ٹھہرے

اس کو پایا، اُسے چھوڑا اور اسے بھول گئے
کام ہم نے وہ کیے ہیں کہ جو مشکل ٹھہرے۔

خشک ہونے پہ نہ جاؤ کبھی دریاؤں کے
پُر خطر اور بھی ہوں گے جو یہ دلدل ٹھہرے

صبح ہوتے ہی وہی جھیل کی صورت چمکے
جس کی آنکھوں میں مری شام کا کاجل ٹھہرے

اس تکلّف پہ جو انصاف ہُوا خوب ہوا
ہم کہ عزّت سے گئے اور وہ چنچل ٹھہرے

○

ہر وقت ساتھ رہ کے بھی اپنی خبر نہیں
ان حادثاتِ دھر کا کس پر اثر نہیں

معلوم کیا ہوا مجھے سب کچھ سمیٹ کر
منظر مری گرفت میں آئے مگر نہیں

اپنے نفس کے ہاتھ سے دھوکا ہوا ہمیں
پالا ہے ایسے پیڑ کو جس کا ثمر نہیں

ہم نے جنوں میں بارہا سوچا ہے اس طرح
اب کے ثمر ہمارا ہے یا پھر شجر نہیں

ہم نے خود اپنی موت کو مشکل بنا لیا
ورنہ رہِ حیات تو کچھ پُرخطر نہیں

کاٹا ہے ہم نے راستہ ہر راہ سے جُدا
اس واسطے ہمارا کوئی راہبر نہیں

ہر اک سے اپنا تذکرہ اے سعدؔ کس لیے
وقعت ہماری سامنے اس کے اگر نہیں

○

چلو اب ختم کر ڈالیں کہانی بھی
رکھیں کیوں یاد ہم باتیں پرانی بھی

نہیں ہے تُو تو بے مقصد ہے جینا بھی
مجھے ہے بوجھ اب تیری نشانی بھی

بڑھاپے کا ہو شکوہ کیا کہ بچپن ہے
ہمیں تو بار گزری ہے جوانی بھی

بہت ہے پُرکشش یہ کشمکش اپنی
ملانی بھی ہے آنکھ اس سے چرانی بھی

یہ آنسو اور آہیں تو ضروری ہیں
کہ پاس اپنے ہَول ہے اور پانی بھی

یہ جلتے بُجھتے لمحے خوب ہوتے ہیں
کہ کہنی بھی نہ ہے بات ان میں چھپانی بھی

غزل لب پر جو آئے تو سبھی بولے
زمانی بھی ہے عیب اس میں مکانی بھی

○

کوئی صورت نکال کر دیکھیں
ہم بھی مجنوں سا حال کر دیکھیں

ایک پتّھر تو موم کیسا ہوگا
خود کو پتّھر میں ڈھال کر دیکھیں

کوئی صورت دکھائی دے تو ہم
خود سے ہی اک سوال کر دیکھیں

دُور ہو جائے گی غلط فہمی
رابطے بھی بحال کر دیکھیں

تیرگی ہے رگوں کے اندر تو
اپنے دل کو مشال کر دیکھیں

سارے چہرے تو ایک جیسے ہیں
لوگ چہرے اجال کر دیکھیں

غم خوشی میں بدل ہی جاتا ہے
غم مسلسل جو پال کر دیکھیں

سعدؔ اپنے سوا بہت کچھ ہے
ہم کہ دُنیا کھنگال کر دیکھیں

○

ساتھ دنیا کے دبے پاؤں بھی چلنا ہو گا
سحر سے اس کے مگر ہم کو نکلنا ہو گا

دوستی اس سے بہت ٹھیک ہے اپنی لیکن
ایسے لمحے ہیں مگر ہم کو سنبھلنا ہو گا

وہ نہیں بدلا تو پھر غور ہو اپنی جانب
زندہ رہنا ہے تو پھر خود کو بدلنا ہو گا

سانس لینے میں کہیں دیر نہ ہو جائے ہمیں
اپنے آرام کو شدّت سے کچلنا ہو گا

اپنی پلکوں سے ستارے بھی چنیں گے ہم لوگ
ایک سُورج کو سرِ شام تو ڈھلنا ہو گا

عشق سُورج ہے تو پھر مسئلہ طے ہی سمجھو
حسن کی برف کو ہر حال پگھلنا ہو گا

اس محبّت میں گواہی کی ضرورت ہی نہیں
یہ ہے وہ جُرم کہ مجرم کو اگلنا ہو گا



یہ زمانہ نہ سمجھ میں آیا
ہاتھ آیا بھی تو جیسے سایہ

خواب نیندوں سے بھرے تھے سارے
رتجگے ساتھ وہ اپنے لایا

پیار ناٹک تھا کہ جس میں اس کو
ہم نے کھویا تو کسی نے پایا

ایسی خوشبو کا کوئی نام نہیں
جس نے سوچوں کو مری مہکایا

بات کچھ بھی تو نہیں تھی شاید
بس یُونہی میں نہ جسے سہ پایا

ایک لمحے کو برس ہیں کتنے
جب پلَٹ جائے کسی کی کایا

سعدؔ کیا کچھ نہ کیا ہم نے وہاں
کیا کریں کچھ نہ جو اس کو بھایا

○

مہر ڈوبا تو مرے ماہ کو باہر لایا
شام ہوتے ہی ہر اک داغ مجھے یاد آیا

یاد آیا وہ کسی شخص سے رشتہ اپنا
بڑھتے بڑھتے ہُوا غائب جو اچانک سایہ

جو سمجھتا تھا کہ یاں میرے سوا کچھ بھی نہیں
مَیں نے اس شخص کو کھو کر ہے سبھی کچھ پایا

رفتہ رفتہ وہ لہو میں مرے تحلیل ہوا
نغمہ اک تارِ نفس پر تھا جو دل نے گایا

میرے انجام سے پہلے نہیں انجام کوئی
اور آغاز بھی انجام تلک ہے چھایا

میری سوچوں نے اٹھایا جو کبھی خواب محل
اشک باری نے اسے دل کی حدوں میں ڈھایا

مجھے یہ ڈر ہے کہ میں رائیگاں نہ جاؤں کہیں
بس اس خیال میں گزرا ہے وقت بے مصرف

کوئی تو حد ہو گزرنے کی اس محبّت میں
اٹھا رہا ہوں مَیں دیوار نفرتوں کی بِن سوچے



کیوں نہ ہم سوچ کے سانچے میں ہی ڈھل کر دیکھیں
وہ جو قائم ہے تو پھر خود کو بدل کر دیکھیں

گو مسافت ہے کٹھن اور نہ رستہ کوئی
لیکن اس حال میں اچھا ہے کہ چل کر دیکھیں

ہم محبّت کو مکمّل نہیں ظاہر کرتے
وہ حنا برگ کو چُٹکی میں مسل کر دیکھیں

زندگی موت میں مخفی ہے یقیناً اپنی
مثلِ پروانہ چلو ہم بھی تو جل کر دیکھیں

ایک کوشش جو ہے اس کی اسے انجام تو دیں
اس کی خواہش پہ ذرا دیر کو ٹل کر دیکھیں

سعدؔ لوگوں سے توقع ہو تو کس بات پہ ہو
مونگ چھاتی پہ مرے روز وہ دَل کر دیکھیں



یاد رکھنا اسے بُھلانا مت
یعنی خود کو یوں آزمانا مت

ہم بھی بیٹھے ہیں ٹھان کر دل میں
اب کوئی داستاں سُنانا مت

اس کی جانب سے پیش رفت ہے شرط
ورنہ تم بات کو گنوانا مت

ساری دُنیا ہے آنکھ میں اپنی
اس کو لا کر یہاں بسانا مت

وہ کہ پانی پہ عکس بیٹھ گیا
ہو سکے تو اسے اٹھانا مت

کتنا آسان ہے یہ کہہ دینا
ڈوبنے سے اسے بچانا مت

تم اکیلے دیارِ غیر میں ہو
دوست بننا مگر بنانا مت



کیوں محبّت کا نشہ جاتا نہیں ہے
کوئی موسم بھی ہمیں بھاتا نہیں ہے

ایک عبرت ہیں زمانے کے لیے وہ
جن کو اپنا بھی خیال آتا نہیں ہے

ایک رشتہ ہے ہمارا ذرا سوچو!
دور کی کوڑی کوئی لاتا نہیں ہے

چلو چھوڑو کہ ہے چھوڑا مجھے اس نے
مگر اس پر بھی وہ پچھتاتا نہیں ہے

کتنا غمناک ہے اس کا یوں بچھڑنا
اب یہ دل بھی ہمیں بہلاتا نہیں ہے

یہ تو خوشبو ہے مرے من کی وگرنہ
گُل کوئی رُوح کو مہکاتا نہیں ہے



دن مشقّت میں اگر تم نے گزارا ہوتا
رات کا چَین تمہیں ہم سے بھی پیارا ہوتا

ہم تری سمت سے پلٹے ہیں تو ایسے ہی نہیں
تُو نے اک بار کبھی ہم کو پکارا ہوتا

تم محبّت کو تجارت کی طرح لیتے تھے
یوں نہ ہوتا تو تمہیں اس میں خسارا ہوتا

یہ تو قدرت کی عطا ہے کہ کھڑا ہوں اب تک
مَیں تو گر پڑتا کبھی کا جو سہارا ہوتا

یہ تو اچھا ہے سمندر میں نہ پھینکا تم نے
ورنہ وحشی کو تو طوفاں بھی کنارا ہوتا

جانے کس بات کی جلدی تھی پلٹ آنے میں
شہر میں اس کے ذرا وقت گزارا ہوتا



میری نظروں سے اگر اس کا نظارا ہوتا
چاند ہوتا وہ، کبھی آنکھ کا تارا ہوتا

خواب کیسا ہے کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں
کاش قسمت میں یہی خواب، ہمارا ہوتا

یہ تو سچ ہے کہ رہے آئنہ خانے میں مگر
ایک شیشے میں کبھی اس کو اتارا ہوتا

اپنے آنے پہ ہے چپ سادھی سبھی نے ورنہ
ہم نہ ہوتے تو ترا ذکر دوبارا ہوتا

دل بھی سیماب صفت ہے کہ یہ ٹکتا ہی نہیں
گر نہیں تھا یہ ہمارا تو تمہارا ہوتا

کیوں نہ اُٹھ جاتے تری بزم سے تیری خاطر
ہم تو بیٹھے تھے، کبھی ایک اشارا ہوتا

ایک حسرت ہی رہی دل میں کہ ہم نے بھی کبھی
اپنا جو کچھ تھا، کسی شخص پہ وارا ہوتا

○

موسمِ گُل کے پلٹنے کے زمانے آئے
رات ہوتے ہی ہمیں خواب جگانے آئے

جتنا بھی وقت ملے کام سمیٹیں اپنا
بیٹھے بیٹھے ہمیں کب نیند نہ جانے آئے

میری حالت پہ وہ جی بھر کے ہنسے ہیں دیکھو
جن کو دعویٰ تھا کہ وہ مجھ کو ہنسانے آئے

مَیں بھی کیا ہوں کہ سرِ دست تہی دست رہا
وقت گزرا تو مجھے یاد بہانے آئے

قافلے اشکوں کے اُترے ہیں مری پلکوں پر
بستیاں آنکھوں کی شاید یہ بسانے آئے

جتنے بھی تلخ شب و روز گزارے مَیں نے
اتنے ہی شیریں مرے لمحے سہانے آئے

پھانس اٹکی ہے گلے میں کہ وہ خود آ جائے
یوں تو اے سعدؔ مجھے سب ہی منانے آئے



مجھے کیا، اب مجھے دیکھو نہ دیکھو
برابر ہے جو تم سوچو نہ سوچو

رُکیں گے قافلے مرضی سے اپنی
نتیجہ کچھ نہیں روکو، نہ روکو

جو بات آئی ہے منہ پر ہم کریں گے
بلا سے اپنی تم ٹوکو، نہ ٹوکو

تمہارے پاس آ کر ہم کھڑے ہیں
یہ تم پر ہے کہ اب بیٹھو، نہ بیٹھو

کسی عالم میں ہم سوئے ہوئے ہیں
تمہیں عرفان ہے، جاگو، نہ جاگو

ہے کائی اب تو سطحِ آب جیسی
دریچے سے ادھر جھانکو، نہ جھانکو

محبّت وہ عمل ہے، اے زمانے!
جو جاری ہے، بھلے چاہو، نہ چاہو



لگی ہے جس سے مجھ شیشے کو ٹھوکر
بہت ہی سخت جاں ہو گا وہ پتّھر

وہ اکثر بھول جاتا ہے کہ مجھ کو
وہی اِک شخص یاد آتا ہے اکثر

محبّت کا کوئی سر پَیر ہو تو!
نہیں اچھی یہ بِن دیکھے کی ٹکّر

نہیں، ایسا نہیں! میرا گماں ہے
کہ ہے یہ آسماں میرے ہی سر پر

یہی اک مستقبل ہونے کی خواہش
پھرایا جس نے ہے مجھ کو بھی در در

نہیں سیکھا سبق مَیں نے کہ اب بھی
سُناتا ہوں کہانی اپنی فر فر

اُسے مَیں اپنے اندر کی کہوں کیا
ہُوا ہے جو مری حد سے بھی باہر



خلائے دہر کے اندر نہ جا سکا کوئی
طلسمِ ذات سے باہر نہ آسکا کوئی

خلاف تیرے تھی سب میں بھری ہوئی نفرت
اگرچہ بات زباں پر نہ لا سکا کوئی

بس ایک ذات ہے جس کا کرم ہُوا سب پر
اگرچہ اس کو بظاہر نہ پا سکا کوئی

یہ بات فطرتِ آب و ہوا سے ظاہر ہے
کہ مثلِ ابر برابر نہ چھا سکا کوئی

مغالطہ نہیں کوئی اسے سمجھنے ہیں
اسے تو یار! سراسر نہ بھا سکا کوئی

یہ عشق بھی تو کوئی دائرہ ہے جس سے کبھی
نہ جا سکا کوئی باہر، نہ آ سکا کوئی



جو خوف سا رہتا ہے وہ خوف خوشی کا ہے
کچھ آسرا سا مجھ کو اس میں بھی غمی کا ہے

مل جاتا ہے جو مانگو پھر کس لیے ہم مانگیں
مل جانے میں ہی شاید احساس کمی کا ہے

اپنے ہی رویّے سے اکتا سا گیا ہوں میں
ہر بات پہ رونا بھی اِک کام ہنسی کا ہے

کیوں ایک سا لگتا ہے سب ہونا نہ ہونا بھی
جو رنگ ہمارا تھا وہ رنگ سبھی کا ہے

اس ہجر کے اُوپر بھی اک وصل کا پردہ ہے
آغاز کسی کا ہے، انجام کسی کا ہے

کچھ کام ہے دامن کا، کچھ کام ہے اس دل کا
اِک بخیہ گری کا ہے، اِک شیشہ گری کا ہے

کچھ شغل نہیں لیکن فرصت بھی نہیں مجھ کو
ہر کام ہے وہ میرا جو کام کسی کا ہے

اے سعدؔ سکوں اپنا لُوٹا ہے تو ہم نے ہی
یہ مسئلہ بھی شاید اس پُوری صدی کا ہے



انہی سے پوچھو کہ یہ شوخ ڈھنگ کیسے ہیں
وہ آئنوں کی طرح ہیں تو سنگ کیسے ہیں

کبھی جو باغ میں بیٹھو تو جان بھی جاؤ
تمہاری یاد کی خوشبو کے رنگ کیسے ہیں

یہ ٹھیک ہے کہ گلہ ہے نہ کچھ شکایت ہے
بتائیں کچھ کہ سبھی مجھ سے تنگ کیسے ہیں

ہمیشہ ایک سی حالت کہاں نصیب انہیں
کبھی تو پوچھو تمہارے ملنگ کیسے ہیں

تمہارا ذکر سُنا ہم نے اُن سُنا کر کے
کسی کے پیار میں آمد بجنگ کیسے ہیں

بچھڑ کے تم سے بھی ہنستے ہیں جا بجا اکثر
جو دیکھتے ہیں ہمیں سعد دنگ کیسے ہیں

○

ہم ذرا اور مچل کر دیکھیں
سُوئے مقتل بھی تو چل کر دیکھیں

آگ جذبوں کی بھریں خود میں تو پھر
عشقِ بے تاب میں جل کر دیکھیں

حرفِ حق کا تو بدل کوئی نہیں
ہم زباں اپنی بدل کر دیکھیں

اس کا جلوہ تو ہے قائم ہر جا
ہم ذرا خود میں سنبھل کر دیکھیں

یہ زمیں پاؤں پڑے گی اپنے
عہد چلنے کا اٹل کر دیکھیں

اس میں کیا ہے کہ یہ انداز تو ہے
زندگی اپنی اجل کر دیکھیں

مَیں بے یقیں بھی نہیں ہوں میں بدگماں بھی نہیں
مگر یہ وہم و دیعت ہے حیرتوں کے بیچ

کمال ہے یہ تمہارا زوال آنے پر
کھلا دیے ہیں شگوفے خزاں کے اندر بھی



ہوا کے رُخ کو بدل کر اِدھر بھی کر دے گا
کوئی تو دُور سے مجھ کو خبر بھی کر دے گا

مرے وجُود سے لپٹا ہُوا یہ خوفِ فنا
کبھی کھُلا تو یہ مجھ کو اَمر بھی کر دے گا

جو بیج بویا ہے دل میں کسی کی چاہت کا
یہ اشک اس کو کسی دن شجر بھی کر دے گا

ہے مانگنا مجھے اس سے اسی یقین کے ساتھ
کہ میری سوچ کو اب وہ نظر بھی کر دے گا

نہیں ہے کچھ بھی مری حیثیت مگر پھر بھی
وہ ایک دن مری مٹّی کو زر بھی کر دے گا

وہ اک خیال جو رہتا ہے آس پاس کہیں
یقین ہے کہ مرے دل میں گھر بھی کر دے گا



وسعتِ کون و مکاں دل میں بھلا رکھ دینا
اُس سے باہر مگر اتنا ہی خلا رکھ دینا

قید کرنا مجھے شیشے کی فصیلیں چُن کر
اور باہر مرے پتھریلی ہوا رکھ دینا

ایک خوشبوئے مجسّم پہ ہے دل خوں کرنا
دامنِ گُل میں شفق رنگ صبا رکھ دینا

یہ بھی کیا ہے کہ مجھے منع بھی کرنا اس سے
اور اس میں ہی مرا سارا مزا رکھ دینا

ایک عادت ہے یہ دُنیا کی کہ جب بھی ملنا
ایک نفرت پسِ اظہارِ وفا رکھ دینا

ایک نامہ ہے مرے پاس جو دینا ہے اسے
میری میّت کو مرے پاس ذرا رکھ دینا

اے مری چشمِ ندامت تُو زباں دے مجھ کو
سعدؔ کا کام ہے ہاتھوں پہ دُعا رکھ دینا



اے دل ایسی بھی کیا دُھن
یار ہماری بات تو سُن

خواہش چاند اور تاروں کی
پیدا کرے گی تجھ میں گُن

کتنا کِھلار ہے دُنیا کا
لیکن پیچھے ایک ہی کن

سوچ کے تانے بانے سے
کوئی ردائے حیات ہی بُن

پیار نری رسوائی ہے
اس رستے کو دیکھ کے چُن

وقت گزرتا جاتا ہے
بند کرو یہ چُھن چُھن چُھن



چاند نکلا ہے بادلوں کے بیچ
جیسے رہبر ہو قافلوں کے بیچ

ایک طوفاں ہے آنکھ میں لیکن
ہر سمندر ہے ساحلوں کے بیچ

ہم جُدا ہیں مگر نہ جانے کیوں
اک تعلّق ہے فاصلوں کے بیچ

اب کے پاگل ہے ایسے لوگوں میں
جیسے اک شخص پاگلوں کے بیچ

علم اکیلا مقابلے پر ہے
کیسے چُپ ہے وہ جاہلوں کے بیچ

یہ بھی ہوتا ہے خوف آنے پر
لاش پھرتی ہے قاتلوں کے بیچ

کیا تخیّل کی ہے اُڑان کہ سعدؔ
جا کے اُلجھا ہے کاکلوں کے بیچ



مجھے مشکل میں ڈالا بے سبب اُس نے
لگایا لب پہ تالا بے سبب اُس نے

بہت سی مکڑیوں کی جان تھی اُس میں
اُتارا گھر سے جالا بے سبب اُس نے

نہ لکھتا کچھ تو پھر بھی ہم سمجھتے تھے
کیا کاغذ کو کالا بے سبب اُس نے

وہ ہوگا غم زدہ اک دن مَیں ڈرتا ہوں
فقط خوشیوں کو پالا بے سبب اُس نے

یونہی چندا کو گرنا تھا تو پھر کیونکر
سمندر کو اُچھالا بے سبب اُس نے

اُسے کہنا گرا دے مجھ کو آنکھوں سے
مجھے اب تک سنبھالا بے سبب اُس نے

یقیناً شعر میرے ہوں گے اس میں بھی
نہیں پھاڑا رسالہ بے سبب اُس نے

مجھے تو زخم سہنے کی تھی خُو اے سعدؔ
کیا ہے کیوں ازالہ بے سبب اُس نے



یہی تو ہر اک کو غم رہا ہے
کہ اس جہاں میں وہ کم رہا ہے

بہت توانا تھا اپنا ماضی
تبھی تو ہم میں یہ دم رہا ہے

نمو ہمیشہ رہی ہے باقی
جہاں بھی آنکھوں میں غم رہا ہے

فرازؔ کیسا خدا خبر ہے
کہ سر تمہارا تو خم رہا ہے

یہ بے حسی ہے کہ خوف میرا
کہ خوں رگوں میں بھی جم رہا ہے

چلو کرو اس کا ذکر پھر سے
کہ سیل اشکوں کا تھم رہا ہے



جو میرے رستے پہ چل رہا ہے
وہ اپنا ورثہ بدل رہا ہے

سمندروں کی طرح ہوں مَیں بھی
کہ مجھ میں طوفاں مچل رہا ہے

وہ زندگی سے قریب تر ہے
جو عین فطرت پہ پَل رہا ہے

نظر سے اوجھل ہے غم کی قیمت
یہ اشک موتی میں ڈھل رہا ہے

جو دیکھنا ہے تو دیکھ لو اب
وگرنہ آنکھیں وہ مل رہا ہے

جو تم کو کرنا ہے آج کر لو
نہ کل رہے گا نہ کل رہا ہے

یہ خوف ہے یا کہ وہم میرا
جو مونگ سینے پہ دَل رہا ہے

اے سعدؔ اس کو بھلا بھی دے اب
کہ وقت کروٹ بدل رہا ہے

دو شعر

ٹھنڈک ملی ہے گرمی سے سایے کے رُوپ میں
نعمت تمازتوں کی ہے سردی کی دُھوپ میں

اپنا خیال ہے مگر احساس بھی تو ہے
اک ذائقہ نیا سا ہے گویا کہ سُوپ میں

دو شعر

یہ ہونا تو ہمارا خواب جیسا ہے جسے ہم چھو رہے ہیں سعدؔ
مگر دیکھو نہ ہونا اک حقیقت ہے جسے ہم سوچتے ہیں سعدؔ

نہیں ہم ڈھونڈتے حق کو کہ اس میں خود کو رد کرنا ضروری ہے
سبھی ہیں خواہشات اپنی جنہیں دن رات ہم سب پوجتے ہیں سعدؔ



کوئی حد ہے کہ نہیں اس کی الٰہی توبہ
حبس موسم میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا

میرے حاکم تو ہیں غدّار مرے آبا کے
اس حقیقت سے مگر میں نے نہیں کچھ سیکھا

ایک طوفاں تھا مرے پاؤں کے نیچے بچپن
اپنی منزل کی طرف پیر نہ اپنا اٹھا

میری سوچوں میں تھی پرواز عقابوں جیسی
میرے سر کا مری دستار نے رستہ روکا

گو مَیں وارث تو ہوں سب سے بڑی سچائی کا
کیا کروں اس کا کہ خود ہی تو مَیں جھوٹا نکلا

میری طاقت ہے مرے جذبۂ پیہم میں نہاں
مَیں نے خود بھی تو کسی طور یہ سوچا ہوتا



ہم نے گردش میں ستارہ کر لیا
گویا سب کچھ ہی گوارا کر لیا

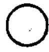
کیا چُھپایا تم نے اپنے ذہن میں
ہم نے آنکھوں سے نظارا کر لیا

اپنا کیا ہے کر لیا ہے پھر یقیں
اُس نے جب وعدہ دوبارہ کر لیا

قطرہ قطرہ بن گیا اک آئنہ
ہم نے دل کو پارہ پارہ کر لیا

خوف میں احساس جاگا اس طرح
ہم نے جگنو کو شرارہ کر لیا

کیا فریب اس آنکھ کو دل نے دیا
چاند کو بھی اک ستارہ کر لیا



جھانکا جو دل میں اپنے پذیرائی مل گئی
آنکھیں کھلیں جو اپنی تو بینائی مل گئی

شہرت کے پیچھے اپنے بڑی سیدھی بات ہے
عزّت جو دی کسی کو تو رسوائی مل گئی

تنہا ہوئے تو ساتھ ہی میلہ سا لگ گیا
لوگوں میں آ کے بیٹھے تو تنہائی مل گئی

اچھا ہوا کہ بعد کے نقصان سے بچے
پہلے ہی معرکے میں جو پسپائی مل گئی

صد حیف ان پہ سعد کہ وہ مطمئن بھی ہیں
جن کو کہ سطحِ آب سے گہرائی مل گئی



اُس کی آواز کی تصویر بنانا چاہی
گویا اک سوچ کی تحریر بنانا چاہی

گو مقدّر نہ چلا ساتھ کسی کے ہرگز
ورنہ ہر شخص نے تقدیر بنانا چاہی

کیا تماشہ ہے کہ پھر خواب نہ آیا مجھ کو
مَیں نے جب خواب کی تعبیر بنانا چاہی

یہ بھی اچھا ہے کہ بس میں نہیں نکلا کچھ بھی
ہم نے تو جُرم کی تدبیر بنانا چاہی

اپنی گفتار میں جذبے نے رکاوٹ ڈالی
سامنے اس کے جو تقدیر بنانا چاہی

ان کی زلفوں کے اسیر ایسے ہوئے ہم دیکھو
اپنے لفظوں سے بھی زنجیر بنانا چاہی

ہزار شوق سے آؤ تمہاری مرضی ہے
مگر وہ لمحۂ لطف و کرم تو بیت گیا

تمہیں یہ وہم کہ آگے نکل گئی دنیا
تم اپنی سانس پہ چلتے رہو جہاں تک ہو



نہیں گرفت میں اپنے ہماری سوچیں بھی
ملے جو وقت کبھی تو تمہاری سوچیں بھی

کسی خیال نے سب کچھ بھلا دیا مجھ کو
کسی خیال نے آ کر سنواری سوچیں بھی

ہمارے شعر کو دیکھو تو دل پہ ٹھیس لگے
کہ ہم نے شیشے میں اپنے اتاری سوچیں بھی

بہت دلیل سے میں نے اُسے جُدا تو کیا
مگر نہ دل نے سنی اور نہ ہاری سوچیں بھی

وہی سوار ہے اب توسنِ تخیّل پر
ہے بے خیال نے کیسے سدھاری سوچیں بھی

کسی سے شکوہ نہیں ہے قصور اپنا ہے
اُدھار لو تو ملیں گی اُدھاری سوچیں بھی

کسی نے ذہن کو ماؤف کر دیا ایسے
کہ در بدر رہیں پھرتی بھکاری سوچیں بھی



مجھے قبول ہے جو کچھ کہو، کہو تو سہی
مری گرفت سے باہر رہو، رہو تو سہی

ہماری آنکھ میں چاہت فقط تمھاری ہے
گو اشک بن کے وہاں سے بہو، بہو تو سہی

ذرا سی دیر میں نرمی دکھا گئے تم بھی
کسی کے واسطے سختی سہو، سہو تو سہی

کھول کے رکھنا اپنی آنکھیں اپنی اپنی جانب تُم
کوئی سنبھل بھی نہ پائے گا پھر جب اس دل نے وار کیا

اچھا تھا تصویر پہ اس کی گرد جمی ہی رہ جاتی
اچھا خاصا منظر ہم نے جھاڑ کے یونہی غبار کیا



دوستوں میں تمھیں شمار کیا
خود پہ کیسا یہ اعتبار کیا

اب اتاریں گے قرض بھی اپنا
کیوں اسے ذہن پر سوار کیا

کاش کچھ دیر رو ہی لیتے ہم
دل کا ہلکا نہ کیوں غبار کیا

میں کہ آخر ہوا شکار اس سے
اُس نے پہلے مجھے شکار کیا

وہ کہ کالی گھٹا کی صُورت تھا
اس نے مجھ کو بھی اشکبار کیا

ہم نے سب کچھ اسی پہ چھوڑ دیا
اس نے چاہت کو کاروبار کیا

کیا ملا عشق میں بتاؤ تو
اُس کو رُسوا تو خود کو خوار کیا



ہم نے اس پر جو دل نثار کیا
دل نے یہ کام بار بار کیا

گوندھ کر ریت اپنے اشکوں سے
ہم نے صحرا کو کوہسار کیا

وہ بھی تنہا رہا ہے میری طرح
ضد نے دونوں کو شرمسار کیا

راز رکھا ہے اب کے اپنا یوں
ہم نے ہر اک کو رازدار کیا

کسی آفت نے سر نکال لیا
جب بھی ماحول سازگار کیا

کتنے رنگوں میں نار نکلی پھر
اُس نے اس دل کو جب انار کیا



جو مرے قریب نہ آ سکا
میں اسی سے دُور نہ جا سکا

مرا پیار بھی کوئی پیڑ تھا
کہ جو برگ و بار نہ پا سکا

مَیں خزاں کی رُت میں جُدا ہوا
مَیں بہار رُت نہ منا سکا

اُسے دیکھ لیتا میں اک نظر
جسے دل کبھی نہ بھلا سکا

مَیں تھا بے خودی کی گرفت میں
کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا

مرے شعر پڑھ کے وہ یوں اٹھا
کہ مَیں درد بھی نہ چھپا سکا



مجھے قریب سے دیکھو کہ دُور سے دیکھو
مگر ہے شرط کہ اپنے شعور سے دیکھو

تمہارا عجز بھی اُن کو ہی دیکھنا ہو گا
نہ خاک زادوں کو اتنے غرور سے دیکھو

غرض ہے بات سے ہم کو، کہ اہتمام سے ہو
نگاہِ فیل سے دیکھو یا چشمِ مُور سے دیکھو



ہمارا دھیان کبھی بٹ گیا تو سوچیں گے
تمہاری یاد میں دن کٹ گیا تو سوچیں گے

ابھی تو ابر ہے غم کا چہار سو دیکھو
نشاطِ باد سے یہ چھٹ گیا تو سوچیں گے

ابھی سفر کا ہے آغاز کس لیے سوچیں
وجود گرد سے جب اَٹ گیا تو سوچیں گے

ابھی تو رستے میں اُس دلکشی نے گھیرا ہے
ہماری راہ سے وہ ہٹ گیا تو سوچیں گے

دو شعر

مَیں اپنے سحر میں رہتا ہوں کیسے شام و سحر
مگر ہے خوف کہ اک دن یہ ٹوٹ جائے گا

ہمارے ہاتھ میں آنچل تھا یار کا لیکن
کسے یقین تھا اک دن یہ چھوٹ جائے گا

دو شعر

ہوا میں تیرتے پھرتے حسین ہاتوں کو
نظر لگے نہ تمھاری شگفتہ باتوں کو

حنوط کر کے میں رکھتا اگرچہ ہر منظر
مگر میں ہوش میں کب تھا بہار راتوں کو



ڈوب جانا چاہیئے یا پھر ڈبونا چاہیے
جنگ ہو تو فیصلہ بھی اس کا ہونا چاہیے

اشک ڈالے آخر اس نے دامنِ کشکول میں
بے بسی پر اپنی اب تو کھل کے رونا چاہیے

کوئی ایسا کام پکڑیں جو کہ ممکن ہی نہ ہو
چاند پر جو داغ ہیں ان کو بھی دھونا چاہیے

آ گئی بالوں میں چاندی اب تو اتنا جان لو
جاگنا لازم ہے ان پر جن کو سونا چاہیے

دل تھا شاید سوچ لینا اس کو پا لینے کے بعد
جو خزانہ پاس ہے اب اس کو کھونا چاہیے

ہم تو ہیں بے چین ازل سے کس گھڑی آرام ہو
پھول موسم میں بھی کانٹوں کا بچھونا چاہیے

کچھ نہیں ہے دل میں اپنے ایک خواہش کے سوا
بے حسی پر سعدؔ اپنی ہم کو رونا چاہیے



کبھی کتابوں کی صُورت کبھی رسالوں میں
ہمارا نام ملے گا سبھی حوالوں میں

وہ قیمتی سہی لیکن تھا خام صورت میں
تراش کر اُسے لایا ہوں میں مثالوں میں

مَیں سوچتا تھا کہ اب وہ جواب کیا دے گا
مگر بھلا دیا سب کچھ جو تھا سوالوں میں

کیا ہے مَیں نے جو محسوس کہہ نہیں پایا
یہی کمال ہے باقی مرے کمالوں میں

کسی کے پیار میں ایسی کہی غزل مَیں نے
کہ تذکرہ مرا ہونے لگا غزالوں میں

ذرا سی آئی سمجھ تو یہ خود ہی ختم ہوا
ہمارا بیٹھنا اٹھنا پری جمالوں میں

ہماری قدر کریں گے تو سعدؔ دل والے
کہ ہم بھی اشک چھپاتے رہے رومالوں میں



عبث نہیں کہ جو ہم اس کی دید کرتے ہیں
ہلال دیکھ کے کچھ لوگ عید کرتے ہیں

ہمارا نرم رویّہ ثبوت ہے اس کا
کہ پیار کرتے ہیں ہم تو شدید کرتے ہیں

یونہی نہیں ہیں یہ ایذا پسندیاں اپنی
ہم اس کے غم سے خوشی بھی کشید کرتے ہیں

سخن وری کا اثر اُس پہ بھی ہوا کہ نہیں
یہ کام ہے تو اسے ہم مزید کرتے ہیں

ہماری جنگ ہُوئی ہے تو اپنے جذبوں سے
ہم اپنے ہاتھ سے اُن کو شہید کرتے ہیں

یہ جھوٹ کیا کچھ ہے جادو سا اس کی باتوں میں
جو بات اس سے نہیں ہے بعید کرتے ہیں

حُسین ہوتے ہیں جو بھی وہ جان دیتے ہیں
اور ان پہ ظلم ہمیشہ یزید کرتے ہیں